نظامِ تعلیم کی نظریاتی تشکیل

سلیم احمد

ترجمان القرآن: اپریل 2016ء

کسی بھی نظریاتی مملکت میں تعلیم کا مقصد ایسے افراد پیدا کرنا ہوتا ہے، جو اس کے نظریے پر پختہ یقین رکھتے ہوں اور اپنی زندگیوں کو اس نظریے کے مطابق ڈھال سکیں۔ پاکستان ان معنوں میں ایک نظریاتی مملکت ہے کہ اس کی بنیاد اسلام پر ہے، اور یہ [عصرِ حاضر] میں اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اس لیے پاکستان میں تعلیم کا مقصد ایسے افراد پیدا کرنا ہے، جو اسلام پر مکمل یقین رکھتے ہوں اور اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، یعنی پکے اور سچے مسلمان ہوں۔

بظاہر یہ ایک سیدھی سادی اور منطقی بات ہے، جس میں کوئی پیچیدگی یا اُلجھاؤ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ہم اس بات پر عملی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو بہت سے سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں، جن پر غور کیے بغیر اور ان کا کوئی تشفی بخش جواب سوچے بغیر، ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ایک سوال یہ ہے کہ ہم جب اسلام کو عہدِ جدید کے تقاضوں سے مشروط کرتے ہیں تو اس سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟ کیا [اکیسویں] صدی عیسوی میں مسلمان ہونا، پندرھویں صدی ہجری میں مسلمان ہونے سے مختلف بات ہے؟ دوسرے لفظوں میں ہمارا سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو [عصرِ حاضر] سے تعلق رکھتی ہیں، اور وہ کیا چیزیں ہیں، جو اسلام سے تعلق رکھتی ہیں اور پھر لمحۂ موجود میں ان کا اشتراک کیا معنی رکھتا ہے؟

ہمارے سامنے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ظہورِ اسلام سے اب تک ہماری معاشرت بہت کچھ بدلتی رہی ہے۔ اسلام عرب کے قبائلی نظام میں پیدا ہوا تھا اور اپنی تاریخ کے مختلف اَدوار میں متعدد معاشروں سے دوچار ہوا۔ ان کے اعتبار سے عرب، عجم، ہندستان، وسطی ایشیا، افریقہ وغیرہ میں مسلمانوں نے کم از کم ظاہری طور پر مختلف شکلیں اختیار کیں۔ اب ان سب ملکوں کی معاشرت میں واضح اور نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام ان تبدیلیوں کے بارے میں کیا رویّہ رکھتا ہے؟ شاید یہ سوال ایک مثال سے زیادہ واضح ہو سکے۔

عہدِ جدید سے پہلے پردے کی مختلف شکلیں مسلمان ملکوں اور معاشروں میں رائج تھیں۔ برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں میں بھی اس کی ایک مخصوص شکل تھی۔ ہندستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد جب عورتوں میں بے پردگی پھیلی، تو پورے معاشرے میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی اور عورتوں کے پردے سے باہر نکلنے کو خلافِ اسلام قرار دیا گیا۔ اس کے مقابلے پر جو جدیدیت پسند لوگ بے پردگی کے حامی تھے، انھوں نے ایسے دلائل دینے شروع کیے کہ: ''برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں میں جو پردہ رائج تھا وہ تو غیر اسلامی تھا اور اس کے مقابلے پر موجودہ بے پردگی ہی اسلامی ہے''۔ یہ بحثیں کچھ عرصے تک زور و شور سے جاری رہیں، لیکن اس کے بعد بے پردگی کے رجحان نے قوت پکڑلی اور معاشرے میں دو طبقات وجود میں آگئے۔ ایک طبقہ اُن لوگوں کا، جو اَب بھی عورتوں کو پردہ کراتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا، جن کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔

تاہم، پردہ کرنے والوں میں بھی اب وہ سختی باقی نہیں رہی اور ایک ایسا ڈھیلا ڈھالا [بقاے باہم کا] نظام وجود میں آیا کہ ماں برقعہ اُوڑھ کر باہر نکلتی ہے تو بیٹی بے پردہ ساتھ ہوتی ہے۔ بہ ظاہر حالات جوں جوں تبدیل ہوتے جارہے ہیں بے پردگی کا رجحان زیادہ تقویت پکڑتا جارہا ہے۔ اب عملاً تو یہ بے عملی موجود ہے، لیکن نظریاتی طور پر یہ بات کھل کر طے نہیں ہوسکی کہ دونوں طبقات میں کس طبقے کا عمل اسلام کے مطابق ہے اور کس کا اسلام کے خلاف؟ کم از کم اسلام کے مستند شارحین اس مسئلے پر ویسی بات نہیں کرتے جیسی پہلے کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پچھلے مقتدر نقطۂ نظر کی جگہ ایک خاموش قسم کے سمجھوتے نے لے لی ہے، اور زبان سے صاف طور پر قبولے بغیر بے پردگی کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس کے ذریعے بہت سے دوسرے مسائل کو دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ عورتوں ہی سے متعلق ایک دوسرا سوال مخلوط تعلیم کا ہے۔ آپ ان مثالوں کو پیشِ نظر رکھیں تو آپ کو بہت سے ایسے مسائل نظر آئیں گے، جن میں اسلام کا وہ نقطۂ نظر جو اِن تبدیلیوں کے آغاز میں اختیار کیا گیا تھا، عہدِ حاضر کے رویوں سے متصادم نظر آئے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ [پہلے والے] نقطۂ نظر کے مطابق ہوگا، یا اس میں ان جدید رویوں کو قبول کرلیا جائے گا، جو خواہ کسی زمانے میں اسلامی نہ سمجھے گئے ہوں، مگر موجودہ زمانے میں کسی نہ کسی طرح مسلمانوں میں قبول یا رائج ہوگئے ہیں؟

اُوپر دی ہوئی وضاحت کی روشنی میں یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے کی طرح ہمارا معاشرہ بھی آئے روز نت نئی تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ اس جبر واختیار کی فضا میں: اسلامی نقطۂ نظر سے ہمارا رویّہ کیا ہونا چاہیے؟ ہمیں ان تبدیلیوں کو قبول کرنا چاہیے یا انھیں رد کرنا چاہیے؟ اگر قبول کرنا چاہیے تو اسلام میں اس کا اصول کیا ہے؟ اگر رد کرنا چاہیے تو کیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمیں ویسا رہنا چاہیے جیسے ہم عہدِ حاضر کے آغاز سے پہلے تھے، اور کیا یہ ممکن ہے؟

جہاں تک دین ومذہب کے مستند نمایندوں کا تعلق ہے، ہم یہ دیکھتے آئے ہیں کہ انھوں نے ابتدا میں معاشرے میں رُونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے تغیر کی مخالفت کی۔ بالوں کی وضع قطع، لباس، داڑھی کی مقدار، پردہ، تصویریں کھنچوانا، مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال تک ایسے ہی بے شمار مسائل پر اختلاف موجود تھا کہ یہ اسلامی ہیں یا غیر اسلامی؟ یہاں تک کہ خود جدید تعلیم کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ تھا۔ بعد میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ خاموشی اور پھر رفتہ رفتہ سمجھوتے کا رویہ اختیار کیا گیا۔

اعتراض یہ نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اعتراض یہ ہے کہ عملاً اگر کچھ چیزیں ابتدائی مخالفت کے بعد اختیار کر لی گئیں تو اس اصول کو واضح کیوں نہیں کیا گیا کہ جن کے تحت تبدیلیوں کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ دین کے شارحین اور علماے کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بنیادی سوال کی وضاحت کریں کہ معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں اسلام کا رویّہ کیا ہے؟ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک گروہ جو مذہب سے بھی کچھ شغف رکھتا ہے 'اجتہاد' کے اصول پر زور دیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، ہمارے یہاں ایسے مذہبی مکاتبِ فکر موجود ہیں، جو 'اجتہاد' کے بجاے تقلید کے قائل ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان بطور ایک نظریاتی مملکت کے 'اجتہاد' کو اپنا اصول بنائے گا یا تقلید کو؟ اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ اجتہاد کا حق کسے حاصل ہو گا؟ اب تک صورتِ حال یہ رہی ہے کہ کچھ لوگوں نے انفرادی طور پر جو 'اجتہاد' کرنا چاہا ہے، علما اور معاشرے کی اکثریت نے اسے رد کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ' اجتہاد' اگر ہماری ضرورت ہے تو اس کے لیے باقاعدہ ایک ادارے کی ضرورت ہو گی۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ ادارہ کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہو گا؟ اگر اس کی باگ ڈور علما کے ہاتھ میں ہو گی تو کیا ان میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو تقلید سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہیں؟ اگر نہیں تو پھر کیا علما کے تعاون کے بغیر کوئی 'اجتہاد' مستند سمجھا جاسکے گا؟

یہ سوال بظاہر تعلیم کے مسئلے سے غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو تعلیم کے مسئلے سے ان کا براہِ راست تعلق ہے۔ تعلیم کا مقصد اگر سچے اور پکے مسلمان تیار کرنا ہے، تو ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ ایک سچے اور پکے مسلمان کا ہمارے ذہن میں کیا تصور ہے؟ یعنی وہ ظاہر اور باطن میں کیسا ہوگا؟ اکبرالہ آبادی [م: ۱۵فروری ۱۹۲۱ء] کے الفاظ میں ہم اسے 'مسٹر' دیکھنا پسند کریں گے یا 'مولانا'، یا دونوں کی کوئی ملی جلی شکل؟

ہم نے معاشرتی تبدیلیوں کے حوالے سے جو سوال اُٹھائے ہیں، اب تعلیم سے اُن کے تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کا جواب پردے کے بارے میں یہ ہے کہ پردہ ہونا چاہیے تو تعلیم پر اس کے مختلف اثرات نمایاں ہوں گے۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ عورتوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے؟ جو نقطۂ نظر پردے کے حق میں ہے، وہ عورتوں کے مخصوص سماجی کردار کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک عورت: ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے خاتونِ خانہ ہے، لیکن معاشرے میں اس کا گھر سے باہر کوئی کردار نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نقطۂ نظر سے عورتوں کو ایسی تعلیم نہیں دی جائے گی، جس سے وہ ملازمتوں یا دوسرے پیشوں میں، جہاں مردوں سے اُن کے آزادانہ ربط ضبط کے مواقع ہوں داخل ہو سکیں۔

اسی طرح مردوں کے بارے میں یہ سوال اُٹھایا جائے گا کہ ان کی تعلیم میں سیرت و کردار کی تعمیر کو اوّلین اہمیت دی جائے یا پیشہ ورانہ ہنر مندی کو، یا دونوں کو۔ کچھ عرصہ پہلے جھوٹی گواہی کے مسئلے پر اسلامی نقطۂ نظر سے سفارشات کی گئی ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسا ہی مسئلہ خود وکالت کے پیشے کے سلسلے میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ وکالت بطور پیشے کے، جھوٹے مقدمات سے دامن نہیں چھڑا سکتی۔ اب پہلا سوال یہ ہے کہ پاکستان میں کیا عدالت کا کوئی ایسا نظام پیدا کرنا ہوگا، جس میں وکیل کی ضرورت نہ پڑے یا وکیلوں میں خود ایسی ماہیتِ قلب کرنی پڑے گی کہ وہ جھوٹے مقدمات کی پیروی نہ کریں؟ اگر ہمارا جواب یہ ہو کہ اسلامی معاشرے میں پیشہ ور وکیل کی ضرورت نہیں ہوگی، تو نظامِ تعلیم میں اس کے مطابق ردّوبدل کرنا پڑے گا۔ ایک طرف ضروری ہوگا کہ وکالت کی مخصوص تعلیم ختم کر دی جائے۔ دوسری طرف اس کے بدل کے طور پر ہر طالبِ علم کو اتنا قانون سکھانا پڑے گا کہ وہ وقتِ ضرورت اپنے مقدمے کی پیروی خود کر سکے۔

معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں ایک زیادہ گہری بات یہ ہے، کہ وہ ذہنی تبدیلیوں کا نتیجہ یا سبب بنتی ہیں۔ ذہنی تبدیلی میں خیال، جذبہ اور احساس سب کی تبدیلی شامل ہے۔ ایک ایسا فرد جو بچپن سے مذہبی ماحول میں رہا ہو، ایک ایسے فرد سے مختلف ہوتا ہے، جو طبعاً آزادانہ ماحول کا تربیت یافتہ ہو۔ اس کی مثالیں آپ عورتوں اور مردوں میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک لڑکی جو پردے میں رہی ہو اور روایتی مشرقی ماحول میں پروان چڑھی ہو، وہ جدید تعلیم و تربیت کے گہوارے میں پلی بڑھی لڑکیوں سے اپنے پورے طرزِ احساس میں مختلف ہوتی ہے اور قطعی مختلف قسم کے معاشرتی رویّے کا اظہار کرتی ہے۔

پاکستانی معاشرے میں کس قسم کے معاشرتی رویوں کو پروان چڑھائیں گے اور تعلیم و تربیت کے ذریعے ان میں سے کون سے رویے کی حوصلہ افزائی کریں گے ؟

ذہنی تبدیلیوں کے سلسلے میں دوسرا اہم سوال خالص نصابی نوعیت رکھتا ہے۔ ایک نوجوان، جس کو تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ انسان کے دینی عقائد کی تعلیم دی گئی ہے، وہ اس نوجوان سے مختلف ذہنیت رکھتا ہے جو مثال کے طور پر ڈارون [م: ۱۹، اپریل ۱۸۸۲ء] کے نظریۂ ارتقا پر یقین رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اپنے نصاب میں ان نظریات اور خیالوں کو شامل کریں گے یا نہیں جو دین کی عام تعلیم سے لگا نہیں کھاتے ؟ یہ نظریہ کہ انسان آدم کی اولاد ہے اور یہ نظریہ کہ انسان بندر سے بنا ہے ؟ ہم اپنے بچوں کو دونوں طرح کی باتیں بغیر کسی ترجیح کے سکھاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کی شخصیت میں تضاد، ثنویت اور کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں بہر حال یہ طے کرنا پڑے گا کہ ایسے علوم جو اسلام سے مختلف تصورات پر قائم ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارا رویّہ کیا ہو ؟ ایسے علوم پڑھانے سے کیا ہم گریز کریں گے یا ان کے نظریات سکھانے کے باوجود ان کے بارے میں ایک تنقیدی نقطۂ نظر کو پیدا کرنے پر زور دیں گے ؟ جن نظریات سے اسلامی سیرت و کردار کی تعلیم پر گہرا اثر پڑ سکتا ہے، ان میں بعض نفسیاتی نظریے بھی شامل ہیں۔ ایک طالب علم جو لاشعوری محرکات کے نفسیاتی نظریات سے اثر قبول کرتا ہے، وہ سیرت و کردار کی شعوری تعمیر کے نصب العین سے ہم آہنگی محسوس نہیں کرتا۔ ہمیں اپنی تعلیم میں اس بات کو طے کرنا پڑے گا کہ ہم اپنے بچوں کو ایسے نظریات پڑھائیں یا نہ پڑھائیں ؟ اگر ہمارا فیصلہ یہ ہو کہ ایسے نظریات کی تعلیم دینا مناسب نہ ہو گا، تو پھر یہ سوال پیدا ہو گا کہ ہم اپنے بچوں کو کس کس علم کی تعلیم نہ دیں ؟ دیں تو کس حد تک، اور اس کے بارے میں ہمارا مجموعی رویّہ کیا ہو ؟

ہمارے پُرانے نظامِ تعلیم میں جو فکر و عمل کی یک جائی پائی جاتی تھی، اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اس نظام کا بنیادی پتھر مذہب تھا۔ اس کے نصاب میں جو کچھ سکھایا جاتا تھا، وہ مذہب کی روشنی میں سکھایا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے ہر شعبے کی تشریح و تفسیر، مذہبی نقطۂ نظر ہی سے کی جاتی تھی، اور اگر ایسے علوم کی تعلیم دی بھی جاتی تھی جو مذہب سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتے تھے، تو اُن میں مذہبی نقطۂ نظر شامل کر دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر فلسفۂ یونان کی تعلیم تو دی جاتی تھی، مگر اس کی خالص شکل میں نہیں، بلکہ اُس کے اس جواب کی شکل میں جو مسلمانوں میں 'علم الکلام' کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اس لیے ایک مسلمان طالب علم، فلسفۂ یونان کے مسائل کو کلامی استدلال کی روشنی میں پڑھتا تھا۔ اب اگر اس اصول کو ہم نئے علوم پر منطبق کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں سب سے پہلے مذہب کی روشنی میں ان علوم کا جواب پیش کرنا ہوگا۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنے بچوں کو ان علوم کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر کی تعلیم دے سکیں گے۔

جذباتی باتوں کا تو خیر معاملہ ہی اور ہے، لیکن جو لوگ ٹھوس بنیادوں پر اسلام کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے کہ موجودہ زمانہ غالب طور پر ایک مخالفِ مذہب زمانہ ہے۔ جدید سائنسی اور معاشرتی علوم اپنی بنیاد میں اگر مذہب دشمن نہیں تو کم از کم غیر مذہبی یا سیکولر ضرور ہیں۔ طبیعیات [Physics] میں ہم پہلا اصول کچھ اس طرح پڑھتے ہیں کہ: ''مادّہ [matter] کو نہ پیدا کیا جا سکتا ہے، نہ ختم کیا جا سکتا ہے''۔ دوسری طرف مذہب میں ہمیں تعلیم دی جاتی ہے کہ: ''ہر چیز کا پیدا اور ختم کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے''۔ بالکل اسی طرح نفسیات، بشریات، حیاتیات اور دیگر علوم میں ہمیں بہت سی ایسی باتیں پڑھائی جاتی ہیں، جو مذہبی نقطۂ نظر کے بجائے ایک غیر مذہبی نقطۂ نظر کے حق میں زیادہ جاتی ہیں۔ پاکستان میں اگر تعلیم کا مقصد سچّے اور پکّے مسلمان پیدا کرنا ہے تو ہمیں یا تو ان علوم کی تعلیم بند کرنی پڑے گی یا پھر ان کے مقابلے پر اسلامی علوم پیدا کرنے ہوں گے۔

ہم اگر اسلام کو علوم کی بنیاد بنانا چاہیں گے، تو ہمیں غیر مذہبی یا سیکولر طبیعیات کے مقابلے پر اسلامی طبیعیات، غیر مذہبی یا سیکولر حیاتیات کے مقابلے پر ایک اسلامی حیاتیات، اور اسی طرح درجہ بہ درجہ دیگر اسلامی علوم پیدا کرنے یا پروان چڑھانے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ سر سیّد احمد خاں [م: ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء] کے زمانے میں کچھ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے، جو نوجوانوں کو مذہب سے دُور لے جا رہے تھے، مثلاً: فلکیات کا نیا علم بظاہر ان عقائد سے متصادم تھا، جو اس وقت ہمارے معاشرے میں رائج

تھے۔ زمین کے گول ہونے اور حرکت کرنے کا نظریہ، مادے کے خواص میں تبدیل نہ ہونے کا نظریہ، یہ سب نئے نئے مشہور ہوئے تھے اور یہاں تعلیمی دنیا میں مروجہ تصورات سے متصادم تھے۔

سر سیّد احمد کو ان نظریات کی روشنی میں اسلامی عقائد کی ایک ایسی تاویل پیش کرنی پڑی، جس نے پورے معاشرے میں کہرام برپا کر دیا۔ مذہبی حلقوں کی طرف سے سر سیّد کی تکفیر کی گئی اور عوام میں اُن کو 'نیچری' قرار دیا گیا۔ اکثر حلقوں میں ان پر اب بھی یہ اعتراض ہوتا ہے کہ: ''انھوں نے اسلامی عقائد میں جدید سائنس کا پیوند لگایا''۔ یہ بات اگر بُری تھی تو ہمیں اس بات کا جواب دینا پڑے گا کہ سائنس سے تصادم کی صورت میں ان عقائد کے بارے میں کیا رویّہ اختیار کیا جائے، جو اَب جدید ذہن کو کسی طرح قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتے؟ جواب شاید یہ ہے کہ سوال کو ذہن میں آنے ہی نہ دیا جائے، لیکن یہ رویّہ چند در چند خطرات سے خالی نہیں ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر یا تو آپ ایک ایسا ذہن پیدا کریں گے جو جدید ماحول اور اس کے تقاضوں سے یکسر بے خبر ایک جامد ذہن ہو گا، یا پھر طالب علموں میں خود بخود ایک ناگزیر منافقت کا رویّہ پیدا ہو جائے گا۔ ایسے طالب علم اجتماعی طور پر آپ کے سامنے تو سر تسلیم خم کے رویّے کا اظہار کریں گے، مگر شخصی اور انفرادی طور پر اس پر یقین نہ کریں گے، بلکہ شاید تنفّر اور حقارت کا رویہ اختیار کریں گے۔

ہماری دانست میں یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ایک طرف تو یہ بات بالکل واضح طور پر سرکاری پالیسی کی بنیاد ہو کہ: اسلام کی وہ کون سی چیزیں ہیں جو جزوِ دین ہیں؟ اور کون سی چیزیں ہیں جو صرف ماحول اور زمانے کے اثر سے کسی خاص وقت میں اسلامی سمجھ لی گئی ہیں؟ جب کہ موجودہ زمانے میں اُن کی validity [اعتبار، صحت] باقی نہیں رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان مسائل سے دوچار ہو کر مسلمان ائمہ فکر نے جو کچھ سوچا ہے، اس میں کتنا حصہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہے اور کتنا حصہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پروفیسر کرّار حسین [م: ۷ نومبر ۱۹۹۹ء] اور محمد حسن عسکری [م: ۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء] نے مولانا اشرف علی تھانوی [م: ۴ جولائی ۱۹۴۳ء] کے ایک رسالے کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تھا، جس میں مولانا تھانویؒ نے جدید ذہن کے مسائل کی روشنی میں مذہبی نقطۂ نظر سے بعض اصولوں کی تشریح کی ہے۔ یہ کام ابتدائی نوعیت کا ہے اس لیے موجودہ حالات میں زیادہ کار گر اور مؤثر معلوم نہیں ہوتا۔ بہر حال اصولی طور پر ہمیں ایسے کام کی شدید ضرورت ہو گی اور وہ بھی بڑے پیمانے پر جدید ذہن کے اشکالات

اور ضروریات کو سامنے رکھ کر اسلامی عقائد کی قابلِ فہم اور دل لگتی تشریحات کے بغیر ہم اپنے نظامِ تعلیم کو ایک قدم بھی آگے نہ لے جا پائیں گے۔

پاکستان کو اگر نظریاتی مملکت کی حیثیت سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنا ہے، تو اسے اوّلین اہمیت اسی کام کو دینا پڑے گی اور اپنے پورے وسائل کے ساتھ ایسے ادارے قائم کرنے پڑیں گے، جو ایک طرف ایسے لوگوں پر مشتمل ہوں جو دینِ اسلام کا صحیح اور مستند علم رکھتے ہوں، اور دوسری طرف ایسے لوگوں پر مبنی ہوں جو جدید ذہن کے مسائل کو سمجھتے ہوں۔ ان دونوں کے اشتراک سے اسلام کی ایسی تشریح کی جا سکے گی، جو جدید ضروریات کے مطابق مذہب کو نئے ذہن کے لیے نئی زبان اور نئے طریق استدلال کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے۔ یہ کام جتنا زیادہ گہرا اور وسیع ہو گا، اتنی ہی آسانی سے ہمارے نظامِ تعلیم کی بنیاد بن سکے گا۔